سرکار سید العلماء طاب ثراہ بحیثیت مدرس

مولانا سید محمد شاکر نقوی صاحب قبلہ امروہوی استاذ جامعہ ناظمیہ، لکھنؤ

سرکار سید العلماء طاب ثراہ کے سلسلہ میں نہ معلوم کتنی مرتبہ قلم اٹھایا اور رکھ دیا۔ کتنی مرتبہ لکھا اور لکھ کر قلم زد کر دیا۔ جب بھی لکھا دون مرتبت نظر آیا، جو کچھ بھی لکھا شایان شان نہ پایا۔ ظاہر ہے کہ ایک کمال مجسم غیر معصوم کے لئے غیر معصومیت کے تقاضوں اور کمالات کے حقوق کی ادائیگی میرے لئے ممکن نہیں تھی۔

ایک طرف جلالت علمی کا نہیب میری ہر تعریف و توصیف کو کمتر سمجھ کر ٹھکرا رہا تھا اور دوسری طرف خود میرا عقیدہ کوئی ایسی لفظ استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا جو مدح معصومین علیہم السلام کے ہم رتبہ محسوس ہونے لگے۔ خود سرکار سید العلماءؒ کے حقوق تعلیم کا تقاضہ تھا کہ اپنی شاگردی کا پورا پورا حق ادا کردوں لیکن خود اپنے آقا کی غلامی کا مطالبہ تھا کہ مولا کے کسی غلام کو امامؑ نہ کہنے لگوں۔ یہی وجہ تھی کہ ہم نے نہ معلوم کتنے صفحات لکھے اور قلم زد کر دیئے نہ معلوم کتنے عنوانات اٹھائے اور چھوڑ دیئے۔ جب ارادہ کیا حیرت نے گھیر لیا کیا لکھوں؟ کس کس موضوع پر لکھوں؟ کون سا موضوع ایسا ہے جو مستقل ایک کتاب سے کم ہو اور کون سا علمی کمال ایسا ہے جس کو تحریر کرنے کے لئے علمی استعداد درکار نہ ہو۔ جس طرف دیکھئے علم وفضل کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، کس میں دم ہے کہ اسکو کوزے میں سمو سکے۔ کیوں کہ الفاظ اپنی افادیت میں صرف معنی کے رہین منت نہیں ہوتے بلکہ لافظ کی شخصیت کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے اس لئے ہمیشہ اپنی بے سوادی پر نظر ڈال کر خاموش ہو جاتا۔

ظاہر بات ہے کہ اس ذات کے فقیہ العصر ہونے پر بھلا میں کیا قلم اٹھا سکتا ہوں جس کے بعض شاگرد اس وقت عراق و ایران میں مراجع کی فہرست میں خیال کئے جاتے ہوں۔ ایسی ہستی کے علم و ادب پر میں کیا لکھ سکتا ہوں جس کے روبرو عہد حاضر کے بڑے بڑے ادیب گھٹنے ٹیک چکے ہوں۔ بہر حال فقیہ کے کمالات پر غیر فقیہ کا تبصرہ بالکل ایسا ہے جیسا کسی باکمال شاعر کے رنگین اشعار پر کسی نافہم رنگ ساز کی داد سخن۔ اس لئے کسی جامع الصفات کی تعریف و توصیف کا پورا حق کوئی جامع الصفات ہی کر سکتا ہے لیکن جب میں نے یہ محسوس کیا کہ میرا یہ احساسِ بے مائیگی فوت الکل کا باعث بن رہا ہے، مجبوراً قلم اٹھا لیا۔ لیکن کمالات کے اس وسیع چمن زار سے صرف ان دو ایک پھولوں کو پیش کر رہا ہوں جنہیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے حواس سے محسوس کیا ہے ورنہ لاکھوں پھول اس گلزار میں ایسے ہیں کہ جنہیں میری طرح نہ کسی نے ابھی تک دیکھا ہے اور نہ

محسوس کیا ہے۔

دور کیوں جایئے اسی لکھنؤ میں سرکار سید العلماءؒ کو دیکھنے والے تو سب ہی ہیں لیکن کتنے ہیں جو یہ بتلاسکیں کہ سرکار مرحوم فن سپہ گری میں بھی ماہر کامل تھے شاید اگر اتفاق نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو یہ بات پردہ ہی میں رہ گئی ہوتی۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے آس پاس کی بات ہے کہ سرکار عمدۃ العلماء مولانا کلب حسین صاحب طاب ثراہ کے بہنوئی جناب نوابو صاحب حسینیہ غفرانمآبؒ میں لکڑی چلانا سکھاتے تھے۔ مدرسہ ناظمیہ سے ہمارے استاد مولوی منظور حسین صاحب قبلہ بھی سیکھنے کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ میں غالباً اس وقت عالم کی جماعت میں تھا۔ منظور صاحب قبلہ کے ہمراہ میں بھی جانے لگا اور پھر رفتہ رفتہ ہمارے مدرسہ سے حجۃ الاسلام مولانا غلام مہدی صاحب سندھی اعلیٰ اللہ مقامہ، ممتاز العلماء مولانا سید مرتضیٰ صاحب نقوی، حجۃ الاسلام مولانا سید محمد صاحب باسٹوی، حجۃ الاسلام مولانا سید کاظم نقوی اور میرے ہم درس سید کلب ناصر صاحب اور ناصر عباس صاحب بھی شریک ہونے لگے۔ میں، کلب ناصر صاحب لکڑی اور بانک تک پہنچے تھے مولوی منظور صاحب اور ممتاز العلماء ڈھال تلوار کی مشق کرنے لگے تھے۔

اتفاقاً ایک روز جناب رازؔ اجتہادی مرحوم اور سرکار سید العلماء طاب ثراہ امام باڑے میں کسی ضرورت سے تشریف لائے، پورے میدان میں ہر طرف بھری گتکا، بانک، لکڑی اور پیترے کا جماؤ دیکھ کر صبر نہ فرما سکے۔ رازؔ صاحب مرحوم نے شیروانی اتاری اور سرکار مرحوم نے قبا کو لپیٹا، ڈھالیں گردش میں آگئیں، تلوار کے ہاتھ جوہر دکھلانے لگے۔ اس وقت پورے اکھاڑے کی منظر کشی کن لفظوں میں کی جائے ہر شخص کا حیرت سے منہ کھلا ہوا تھا اور استاد نوابو صاحب رہ رہ کر بے ساختہ سبحان اللہ، واہ واہ کہہ کر اچھل رہے تھے۔

پھر کیا تھا، سرکار مرحوم سے سرپرستی قبول کرنے کے لئے عرض کیا گیا اور ایک اجتماعی پروگرام طے کرلیا گیا جس کا یادگاری فوٹو یاد نہیں کس کس کے پاس تھا اتنا معلوم ہے کہ مولوی منظور حسین صاحب قبلہ کے پاس یہ فوٹو اب بھی پاکستان میں موجود ہے۔

اس نئی دریافت ہی کے ضمن میں یہ بھی معلوم ہوا کہ شہسواری میں بھی سرکار کو خاصا دخل حاصل تھا۔ لیکن کشتی اور پہلوانی کے متعلق صرف قیاس آرائی کی جاسکتی ہے کیوں کہ سرکار سلطان العلماء مولانا سید ابن حسن صاحب قبلہ طاب ثراہ کو اس فن سے ایک خاص ارتباط تھا۔ چنانچہ سرکار سلطان العلماء سے سرکار مرحوم کے رشتہ کی قربت کا تقاضہ تو یہی کہتا ہے کہ اس فن میں بھی ضرور شرکت فرمائی ہوگی کیوں کہ ہمارے موجودہ معاشرے میں البتہ یہ فنون غیر ضروری خیال کر لئے گئے ہیں لیکن عہد قدیم میں علماء کے لئے ان فنون میں مہارت بھی تکمیل علمی کا جز تھی۔

بہر حال اس دریافت سے اتنا اندازہ تو لگایا ہی جاسکتا ہے کہ جو شخصیت ضمنی کمالات کو بھی مہارت کی حدوں تک پہنچا دے اس نے اساسی اور بنیادی کمالات کو ارتقاء کی کس منزل

تک پہنچا دیا ہوگا۔ میرے خیال میں اس ارتقاء کو اگر ہم دریافت کرنا چاہیں تو صرف درس ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے کسی کے کمالات علمیہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کیوں کہ یہ بات سبھی کو تسلیم ہے کہ میدان کارزار میں جوہر دکھائے بغیر جس طرح کسی کی بہادری کا قصیدہ تملق سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا بالکل اسی طرح میدان درس میں اپنا لوہا منوائے بغیر فضل وکمال کا دعویٰ غلط فہمی نہیں تو خوش فہمی ضرور ہے اسی لئے یہ بات مشہور ہے کہ عالم کو بس طالب علم ہی خوب پہچانتا ہے۔

جب میں ممتاز الافاضل میں تھا تو معرکہ اعتقادات میں سرکار سید العلماء کا مخالف تھا اس لئے آپ سے پڑھنے سے گریزاں تھا لیکن بات رسائل تک پہنچی تو گاڑی اٹک گئی۔ اس وقت کی مسلمہ شخصیت اصول فقہ ہیں سب سے زیادہ جلیل القدر ہستی سرکار مفتی اعظم مفتی سید احمد علی صاحب قبلہ طاب ثراہ کی تھی لیکن مصیبت یہ آگئی تھی کہ درجہ کے تمام ساتھیوں نے دوسال کا امتحان ایک سال دے دینے کا تہیہ کرلیا تھا ادھر دوسری مصیبت یہ تھی کہ سرکار مفتی اعظم کے سفر زیارات کے دوران مدرسہ کے داخلی امور کا انبار ہمارے درس میں بری طرح حائل ہورہا تھا سبق دو دو سطر کرکے آگے بڑھ رہا تھا۔ طبیعت پریشان تھی کہ یہ کام کس طرح پورا ہوگا۔ چنانچہ ایک روز اتفاقی طور پر مولانا کاظم نقوی صاحب سے ملنے گھر پہنچا تو دیکھا سرکار سید العلماءؒ تشریف فرما ہیں اور مولانا کاظم صاحب رسائل پڑھ رہے ہیں ظاہر ہے کہ اس وقت بغیر نیت جماعت میں شریک ہونا پڑا لیکن مجھ پر کیا گذری اس کا اندازہ آپ ہی کو لگانا ہوگا کیوں کہ جو شخص ابھی تک دو دو سطریں پڑھ رہا ہو اس کے سامنے دم کے دم میں رسائل کی بڑی تقطیع کا پورا ایک صفحہ حل کرکے رکھ دیا جائے تو وہ حیرت کے کون سے مقام پر ہوگا۔

اہل علم کے سامنے رسائل کی بڑی تقطیع آج بھی موجود ہے ایک صفحہ میں پچیس باریک سطریں جس کی ایک سطر عام کتاب کی دو تین سطروں کے برابر یعنی ایک پورا صفحہ سات آٹھ صفحات کے برابر قرار پاتا ہے۔ یہ پورا درس انہیں تمام متعلقہ توضیحات کے ساتھ ایک گھنٹہ میں تمام ہوگیا۔

ظاہر ہے کہ میرے لئے یہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھی لہٰذا سرکار مرحوم کی خدمت میں روزانہ حاضری کی اجازت حاصل کرلی چونکہ طالب علم کے فرائض میں یہ بات شامل نہیں ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کے درمیان موازنہ کرکے پیش کرے اس لئے میں سرکار سید العلماء طاب ثراہ کی اتنی حق تلفی ضرور کروں گا کہ ان کا تقابل اپنے ان اساتذہ سے نہ کروں جو خود سرکار مرحوم کے بھی استاد تھے، ہاں البتہ معاصرین کے تقابل کی جہاں تک بات ہے بلاخوف تردید یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ سرکار مرحوم کو اپنے معاصرین سے وہ نسبت تھی جو ایک مبتدی یا متوسط کو منتہی سے ہوا کرتی ہے۔

بہرحال اس کا صحیح اندازہ مجھے اس وقت ہوسکا جب میں رسائل کے درس میں شریک ہوگیا۔ سات آٹھ صفحوں کے برابر رسائل جیسی کتاب کا ایک ایک صفحہ پانی کرکے رکھ

دینا معمولی بات نہیں تھی۔ اس بات کو اس طرح پیش کروں تو اہمیت کا صحیح اندازہ ہوجائے گا کہ میں اپنے بعض ساتھیوں میں کمزور تھا مولوی علی عابد صاحب کراروی اور مولوی کاظم نقوی صاحب بہرحال مجھ سے بہت زیادہ قابل تھے لہٰذا مجھ جیسا کم سواد اگر درس سے واپس آکر رات کو پورا درس قلم بند کرلے تو اس درس کو پانی نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے ظاہر ہے کہ اتنے طول طویل درس کا روزانہ قلمبند ہوجانا اس بات کی بیّن دلیل تھی کہ اصل عبارت بالکل صاف طور پر حل بلکہ سہل ہوچکی۔ شاید میرا یہ دعویٰ تعلّی میں شمار ہوکر رہ جاتا اگر امتحان کے موقع پر رسائل میں میرے نمبر اپنے دوسرے تمام ساتھیوں سے زیادہ نہ آجاتے۔ مولانا کاظم صاحب سے میرے نمبر زیادہ ہوجانا صرف اس وجہ سے ہوا کہ موصوف درس کی تمام تفصیلات قلمبند فرمایا کرتے تھے اور میں صرف نفس عبارت کا حل لکھتا تھا۔

اس درس کے دوران مجھے ایک یادگار شرف اور حاصل ہوا اور وہ اس طرح کہ جب میں نے درس شروع کیا تھا تو رسائل کے باب الظن ومنھا الامارات المعمولة فی استنباط الاحکام الشرعیة من الفاظ الکتاب والسنة سے میری شرکت ہوئی تھی۔ اس طرح مجھے تقریباً کتاب کے ۹ صفحات کی کمی کو پورا کرنا تھا ادھر سرکار مرحوم کی مصروفیت کے دائرے میں کوئی وقت ایسا نہیں مل پا رہا تھا کہ اس کمی کا تدارک کیا جاسکے چنانچہ میری اس بے بسی کو محسوس فرما کر سرکار مرحوم نے خود حل تلاش فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ اس دوران میرے جس قدر سفر ہوں گے تم کو ان سے آگاہ کرتا رہوں گا تم اسٹیشن پہنچ کر جتنے عرصہ گاڑی نہ چھوٹے اپنے بقیہ اسباق نکال لینا۔

چنانچہ مجھے آج بھی عجیب خوشی محسوس ہوتی ہے اس منظر کا تصور کر کے کہ ڈبہ میں دیگر مسافرین کے استعجابی ماحول میں سلسلہ درس اسی شان تفصیلی کے ساتھ جاری تھا اور وہ تمام نامانوس مسافر موضوع سے غیر متعلق ہونے کے باوجود اس طرح ہمہ تن گوش تھے جیسے خود ان کو بھی پڑھایا جارہا ہو۔ یہ عجیب سلسلہ صرف دو تین مرتبہ ہی چل سکا۔

بہرحال میں اور میری قوم جس قدر بھی افسوس کرے وہ کم ہے کہ ایسی جامع الصفات ہستی کے سارے کمالات یونیورسٹی کے بے فیض ماحول میں گم ہوگئے۔ کاش وقت نے ایسا موقع دیا ہوتا کہ ان درسی کتابوں کے جوہر سامنے آتے۔ کتنے خوش نصیب تھے ہمارے وہ اساتذہ جنہوں نے سرکار سید العلماء سے ہر علم حاصل فرمایا چنانچہ زعیم الملت حجة الاسلام مفتی جعفر حسین صاحب قائد ملت جعفریہ پاکستان جن کا ترجمہ نہج البلاغہ ہندو پاکستان میں مراکز علمیہ کی زینت بنا ہوا ہے۔ رئیس الحکماء مولانا حکیم جناب محمد اطہر صاحب جو فلسفہ ومنطق کے مانے ہوئے استاد اور جامعہ ناظمیہ کے وائس پرنسپل تھے۔ سلطان المنطقیین استاذ الاساتذہ مولانا ایوب حسین صاحب قبلہ طاب ثراہ جنہوں نے خود اور ان کے شاگردوں نے پورے ملک سے اپنا خراج عقیدت حاصل کیا ہے۔ صدر المدرسین عالی جناب

مولانا سید حسین مہدی صاحب قبلہ پرنسپل ناصریہ کالج جون پور جو علمی دنیا میں آج بھی لائق ذکر ہیں، یہ سب سرکار سید العلماء کے شاگرد تھے۔

ان کے علاوہ نہ معلوم کتنے چاند ستارے ہیں جنہوں نے اس مہر درخشاں سے ضیا حاصل کر کے جہل کے اندھیرے چھانٹے۔ کاش! اس وقت یہ سب موجود ہوتے اور اپنے قلم سے روئداد اکتساب تحریر فرماتے، اپنے درس کے واقعات و کیفیات لکھتے جس سے آنے والی نسلوں کو اندازہ ہوتا کہ علمی دنیا میں درسی تقاضے کیا ہیں۔

بہر حال مجھے اس تعداد کا صحیح اندازہ نہیں کہ کتنے افاضل نے سرکار سید العلماء سے کسب فیض فرمایا۔ ۱۹۶۲ء میں افاضل جامعہ ناظمیہ کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لینے کی غرض سے میں نے تقریباً سب ہی افاضل کی خدمت میں عرضداشت پیش کی تھی۔ جن حضرات نے مجھے جواب سے سرفراز فرمایا ان میں سرکار سید العلماء نے بھی ذرہ نوازی فرمائی۔ سرکار مرحوم کا جواب میرے پاس بطور یادگار اس لئے اور بھی زیادہ حفاظت کے ساتھ موجود ہے کہ یہ جواب انگریزی کے دوطرفہ ٹائپ شدہ کاغذ کے حاشیہ پر ہے جس میں بہت ہی مختصر لفظوں میں اپنی خدمات کے اجمالی اشارے ہیں اس کی ایک سطر یہ بھی ہے:

''تدریس کا سلسلہ نجف اشرف میں بھی جاری رہا اور اس وقت کے بعض شاگرد اس وقت علماء عراق میں محسوب ہیں'' کاش! سرکار مرحوم ان علماء کے اسماء گرامی بھی تحریر فرما دیتے جس سے دکھلایا جاتا کہ کیسے کیسے جلیل القدر علماء کو آپ سے نسبت تلمذ حاصل ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ بات ادھوری رہ جائے گی اگر درس کے ساتھ دیگر مصروفیات کو نظر انداز کر دیا گیا کیوں کہ خالص درسی زندگی اور متنوع الشغل زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے گوشہ نشین زندگی قومی زندگی سے مختلف ہوتی ہے اس میں بھی کارداری زندگی اور زعیمانہ زندگی میں بڑا امتیاز ہے، کسی کاردار کو دماغ سوزی سے سروکار نہیں ہوتا، زعیم کے لئے وقت، توجہ، دماغ سوزی، طاقت، صلاحیت سبھی کچھ درکار ہوتا ہے۔ ایک گوشہ نشین جتنی بھی خوش اسلوبی سے درس کی ذمہ داریاں پوری کرے تعجب خیز نہیں ہے۔

لیکن ایک عالمی مرکزیت کا حامل جس کے لئے اوقات عبادت کے علاوہ مجالس کا مقامی اور بیرونی، وقتی اور غیر وقتی بے شمار سلسلہ موجود ہو جس کو مجالس کے علاوہ شادی اور غم کی تقریبات میں واجبی شرکت بھی کرنا ہو، جس کا ذوق علمی، مطالعہ کو وظائف واجبہ میں شمار کرتا ہو، جس کی کثرت مطالعہ تصنیف وتالیف کا قہری لازمہ ہو، جس کی تصنیفات وتالیفات کی کثرت تداخل لمحات کے بطلان کا مذاق اڑاتی ہو، عقیدتمندوں سے ملاقات کے لئے وقت کا دامن تنگ ہو گیا ہو، جس کے سامنے بہ نظر اصلاح کتابوں کا انبار لگا ہو، جس کے روبرو تقریظات لکھنے کے لئے تخلیقات کا ڈھیر لگا ہو وہ غائر تنقیدی مطالعہ بھی کرے، اصلاح بھی دے اور پھر اپنے تمام مشاغل برداری کے ساتھ میدان درس میں مطالب کے دریا بھی بہائے!

یقیناً سوچنے والوں کے لئے ہوش وحواس گم کر دینے والا کارنامہ ہے۔ چنانچہ ہر قلم کار ایک بات کو اچھی طرح جانتا ہے کہ چند تحقیقی سطروں کے لئے کتنا وقت درکار ہوتا ہے

اگر صرف ٹالنے کے لئے بھی سوچ لیا جائے تب بھی خاصا وقت چاہئے ہوتا ہے چہ جائے کہ ہر ہر لفظ پر تنقیدی نظر، ہر ہر سطر پر اصلاحی تصرف، ہر صفحہ پر تحقیقی تصدیق معمولی بات نہیں ہے، ہاں دنیا کے نقاد آئیں اہل بصیرت جمع ہوں، اہل نظر انصاف کی آنکھیں کھول کر سرکار سید العلماءؒ کی تمام کتابوں کا مطالعہ کریں، اصلاح کتب کے مقدمات کا جائزہ لیں، علمی مصروفیات ومشاغل کو پیش نظر رکھیں اور پھر فیصلہ کر کے دنیا کو بتائیں کہ سرکار سید العلماءؒ علم کا پہاڑ تھے یا آسمان؟

سرکار سید العلماء اپنی مصروفیت کے باوجود دوسروں کی تالیفات وتصنیفات کی اصلاح بڑی ذمہ داری کے ساتھ فرماتے تھے۔ اس کا اندازہ لگانے کے لئے نہج البلاغہ کا وہ مقدمہ ملاحظہ کیجئے جس کو آپ نے علامہ مفتی جعفر حسین صاحب قبلہ کے ترجمہ نہج البلاغہ پر تحریر فرمایا ہے۔

مجھے پہلے یہ خیال تھا کہ سرکار مرحوم نے اس ترجمہ کو سرسری طور پر رواروی میں دیکھا ہوگا لیکن میں اس عظمت نگاہ کی گہرائی اور گیرائی کا حق توصیف تک ادا نہیں کرسکتا جس کا صحیح مشاہدہ میں نے خود اپنی کتاب ظفرۃ علی الظفرۃ کے سلسلہ میں کیا۔ اول تو ظفرۃ الزاویہ کی بحث ہی کیا کم خشک ہے اس پر میرا اہل زبان کے روزمرہ سے ناواقف ہونا۔ ظاہر ہے کہ کتاب میں جتنی بھی کمزوریاں ہوں کم ہی کم ہیں۔ میں ڈر رہا تھا کہ سرکار سید العلماءؒ میرا دل رکھنے کے لئے طائرانہ نظر ڈالیں گے، لیکن اپنے ان کیفیات وجذبات کی ترجمانی کن الفاظ سے کروں۔ جب دیکھا کہ کتاب کا کوئی صفحہ ایسا نہیں ہے کہ جس میں تعریف وتنکیر، تذکیر وتانیث اور تطابق ضمیر کی کوئی نہ کوئی اصلاح موجود نہ ہو اور قابل نظر مقامات پر تنقیدی حاشیہ نہ تحریر ہو۔

مختصر یہ کہ میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے جب میری نظر سرکار سید العلماءؒ کے دست مبارک سے تحریر شدہ تقریظ کی ان وقیع لفظوں پر پڑی جو میری عزت افزائی کے لئے استعمال فرمائی تھیں۔ میری تمام تر قوتِ پرواز تمام تصوراتی حدود، تمام قیاسی وسعتیں، تمام فکری صلاحیتیں، تھک کر عاجز ہوجاتی ہیں، جب میں سوچنے لگتا ہوں کہ ایسی عظیم دقت فکر کا حامل ایسی تفصیلی گہرائیوں تک پہنچنے والی عمیق نظر کا مالک، تمام صاحبان بصیرت کو محو حیرت بنا دینے والا مبصر، اہل تحقیق کو گنگ کر دینے والا مقرر، اہل ذہن کو حیرت زدہ کر دینے والا ادیب، جس کی دھاک علماء کے دلوں پر بیٹھی ہوئی، جس کا سامنا کرتے ہوئے عالمی شہرت کے متوالے کتراتے، جس کے وجود سے ہماری قوم کا وقار قائم، جس کا لوہا دوست اور دشمن اپنے اور غیر ملکی سب ماننے والے۔ اس کی عظمتوں کا اظہار کن لفظوں سے کیا جاسکتا ہے۔

اور پھر اس سے بھی ہزار ہا گنا زیادہ حیرت اس وقت ہوتی ہے جب یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ہر چہار جانب سے مخالفین کی یلغار ہے ہر روز ایک نیا اذیت ناک شاخسانہ ہے، ہر لمحہ ایک نئی روحانی تکلیف ہے، ہر لحظہ نرالی نفسیاتی جنگ ہے پھر بھی علمی انہماک کا وہی عالم ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی صاحب قلم دوات وقرطاس لئے بیچ میدان میں لکھ رہا ہو اور چاروں طرف سے تیر ونشتر برسائے جارہے ہوں۔ اینٹیں، پتھر، آگ، انگارے پھینکے جارہے ہوں اور وہ علم کا پہاڑ، علم کی چٹان سب سے بے پروا کسی زخم کو نظر میں لائے بغیر مصروف تحریر ہو......۔

